میں یہی بات قرار پائے گی، کہ عدل و احسان کے تقاضے کس میں منعکس ہوتے ہیں ـــــ پھر معاملہ کی جو صورت زیادہ عادلانہ ہوگی، اور جس میں احسان کی جھلک زیادہ پائی جائیگی، اسی کو حق اور صحیح ٹھہرایا جائیگا اور جو صورت اس کے برعکس عدل و احسان کی کماحقہٗ ترجمانی نہیں کریگی۔ اس کو مسترد کر دیا جائیگا، غور فرمایئے، کہ ان میں حجیت و استناد کی بنیاد دیں، اس کے سوا اور کون ہو سکتی ہیں، کہ یہ عدل و احسان کے تقاضوں کو اپنے دامن میں پوری طرح سمیٹے ہوئے ہیں ـــــ اسی طرح حضرت عمرؓ نے بھی تشریع کے بعض اطلاقات میں جو تصرف روا رکھا، تو اس کی توجیہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتی، کہ ان دو تقاضوں کی رعایت بہر آئینہ ضروری ہے ـــــ اور پھر عدل و احسان سے متعلق یہی بات درست نہیں، کہ یہ فقہ ہی کی دو بنیادی قدریں ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یوں کہئے، کہ دین کی پوری عمارت ان دو ستونوں پر استوار ہے۔

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (نحل)

اللہ تعالیٰ عدل و احسان کے تقاضوں کو نبھانے کا حکم دیتے ہیں

ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون۔ (نحل)

اللہ کی معیت ان لوگوں کو حاصل ہے، جو متقی ہیں اور ان لوگوں کو جو محسن ہیں۔

اعدلوا ھو اقرب للتقوی (مائدہ)

عدل و انصاف سے کام لو، یہ تقویٰ سے قریب تر بات ہے

واحسن کما احسن اللہ الیک (قصص)

اور احسان و حسن سلوک کا برتاؤ کرو، جس طرح کہ اللہ نے تمہارے بارے میں احسان سے کام لیا۔

ان اللہ کتب الاحسان علیٰ کل شئ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ و اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح (مسلم)

اللہ نے ہر چیز کے بارے میں احسان کا حکم دیا ہے حتیٰ کہ جب تمہیں قتل کرنا پڑے، تو اس میں بھی تقاضائے احسان کو فراموش نہ کرو، یعنی عمدگی سے قتل کرو، اور جب ذبح کرو تو بھی عمدگی سے ذبح کرو۔

آج جس اشکال و پیچیدگی کا سامنا اسلامی فقہ کو ہے بعینہٖ وہی اشکال پوری دنیائے انسانیت کا بھی ہے، یعنی تعلیمات کی وہ کون سی عملی صورت ہو سکتی ہے جو انسان کو انسان کے ظلم سے بچائے اور عدل و احسان کی سطحوں پر لا کھڑا کرے، اس لئے اگر ہمارے ہاں کے اہل علم نے ان دو قدروں کو سامنے رکھ کر زندگی کا ڈھانچہ بنا ڈالا اور فقہ جدید کو ان دو اصولوں کی روشنی میں مترتب کیا، اور ان ہدایات کا بھی خیال رکھا، جن کی ہم نے جستہ جستہ نشاندہی کی ہے، تو یہ احسان نہ صرف فقہ پر ہوگا بلکہ پوری انسانیت اس کے لئے ان کی منت پذیر ہوگی۔

پروفیسر محمود احمد

ہمارے زرعی مسائل

پاکستان ایک زرعی ملک ہے، اور قومی فلاح و بہبود کے لئے زرعی اصلاح و ترقی ملک کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے۔ لیکن پاکستان کے موجودہ زرعی نظام کے جائزہ سے یہ چیز واضح ہوتی ہے، کہ زمیندار اور مزارع کی دو عملی زراعت کو ابھرنے کا موقع نہیں دے رہی ہے۔ عام طور پر زمیندار سرمایہ لگانے سے گریز کرتے ہیں۔ کیونکہ نصف فائدہ مزارع حاصل کرتا ہے اور عام طور پر مزارع پوری محنت نہیں کرتے، کیونکہ نصف فائدہ زمیندار کو پہنچتا ہے۔ اس کا علاج وہی ہے جو ساری دنیا خواہ وہ اشتراکی ہو، یا سرمایہ دار، اختیار کر چکی ہے یا کر رہی ہے، کہ زمین کی ملکیت بتدریج کاشتکار میں منتقل کر دی جائے، اور ہماری زرعی اصلاح کی یہ پہلی بنیادی اینٹ ہونی چاہیئے کہ کوئی زمین کا ٹکڑا کسی ایسے آدمی کو کوئی فائدہ نہ پہنچائے جس پر وہ خود محنت نہیں کرتا، گویا زمین کی فصل کلیتاً اس کو ملے جو زمین پر کام کرتا ہے۔

یہ اصول تو بیشتر لوگ تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن وقت یہ پیدا ہوتی ہے کہ زمیندار کو معاوضہ دیا جائے یا نہیں، اور دیا جائے تو کتنا، اور اس تفصیل میں عموماً مختلف گروہوں کا شدید اختلاف نظر آتا ہے۔ معاوضہ دینے اور نہ دینے کا جھگڑا تک تعلق ہے ماسوا ان لوگوں کے جو ایک خاص قسم کے معاشی ماحول سے متاثر ہیں، اور روحانی قدریں نظر انداز کر دیتے ہیں، باقی سب لوگ یہ جانتے ہیں، کہ معاوضہ ادا کیا جائے۔ یہ کہنا کہ زمیندار اتنا فائدہ اٹھا چکا ہے، کہ اب اس کو زمین کے معاوضہ کا کوئی حق نہیں رہا۔ اخلاقاً اور قانوناً درست نہیں ہو سکتا، زمیندار اگر فائدہ اٹھا چکا ہے تو وہ بہت عرصہ ایک اہم معاشی ضرورت کو پورا بھی کرتا رہا ہے۔ اور اسی بنا پر وہ اتنے زمانہ تک زمین کی پیداوار سے فائدہ اٹھاتا رہا، اب اگر بدلے ہوئے معاشی ماحول میں اس کی ضرورت نہیں رہی، تو یہ اس کا قصور نہیں اور اسے اس کی زمین کا معاوضہ بہرحال ملنا چاہیئے۔ قوم اگر آج یہ محسوس کرتی ہے کہ قومی ترقی اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک زمیندار کو علیحدہ نہیں کر لیا جاتا تو قوم کو اس علیحدگی کی قیمت ادا کرنی چاہیئے۔

ہم نے عمداً علیحدگی کی قیمت کہا ہے، زمین کی قیمت نہیں۔ جو لوگ زمیندارہ مفاد سے تعلق رکھتے ہیں وہ عموماً یہ کہتے ہیں کہ اگر زمین کی پوری قیمت ادا نہ کی جائے تو یہ بھی ایک حد تک زمین سلب کرنے کے برابر ہے، اور بظاہر ان کی دلیل قوی بھی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر تفصیلاً اس مسئلے کو جانچا جائے تو صورتِ حال مختلف نظر آتی ہے۔ سوال یہ ہے، کہ گذشتہ پچاس سال میں زمین کی قیمت بیس بیس اور تیس تیس گنا تک چڑھ چکی ہے، یہ صحیح ہے، کہ اس عرصے میں روپے کی

قیمت بھی کافی گری ہے، لیکن اس کے باوجود زمین کی قیمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ معاوضہ طے کرتے وقت قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کی قیمت میں اضافہ زمیندار کی محنت کی وجہ سے کتنا ہے اور قومی نوعیت کے وجوہات کو اس میں کتنا دخل ہے۔ زمینوں کی قیمتوں کے غیر معمولی اضافے کی وجوہات تو بہت سی ہیں، لیکن اہم ترین اسباب یہ ہیں :۔ سڑکوں، ریلوں اور نہروں کی تعمیر، آبادی کا پھیلاؤ، تجارت اور صنعت کی ترقی۔ اب ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس کا زمیندار کی ذاتی کوششوں کے ساتھ کوئی زیادہ تعلق ہو۔ یہ صحیح ہے کہ زمیندار بھی باقی لوگوں کی طرح آبادی پھیلاتا رہا، یا سڑکوں، ریلوں، نہروں کی تعمیر اور صنعت و حرفت کی ترقی میں دلچسپی لیتا رہا۔ لیکن اگر صرف وہ ایسا کرتا اور باقی لوگ ایسا نہ کرتے تو اس کی زمین کی قیمت میں کوئی اضافہ نہ ہوتا، اس اضافہ کی وجوہ قطعی طور پر قومی ہیں انفرادی نہیں، لہٰذا اضافے کا بیشتر حصہ بھی قوم کو ملنا چاہیئے اور کسی ایک فرد کو اس اضافے کا مالک اپنے آپ کو نہیں سمجھنا چاہیئے، جب ایک فرد دوسرے فرد سے زمین خریدتا تھا وہ یہ اضافہ بھی مالک کو دے دیا کرتا تھا۔ لیکن اب قومی تقاضوں کے پیش نظر خود قوم کو ان زمینوں کی ضرورت ہے جن کی قیمت میں اضافہ کا کثیر حصہ قومی سرگرمیوں کا نتیجہ ہے اور ظاہر ہے کہ قوم فرد کو وہ اضافہ ادا نہیں کرے گی جو خود اس کی وجہ سے زمینوں کی قیمت میں ہوا ہے۔ اور نہ فرد کو قانوناً یا اخلاقاً اس اضافے کو حاصل کرنے کا کوئی حق نظر آتا ہے۔

اب کیا ہر زمین کے ٹکڑے کی قیمت علیحدہ علیحدہ معین کی جائے۔ اس اعتبار سے کہ قومی سرگرمیوں کی وجہ سے قیمت میں جو اضافہ ہوا ہے اسے منہا کر دیا جائے؟ ظاہر ہے، کہ ایسا کرنے میں بے انتہا محنت، وقت اور روپیہ خرچ ہوگا، اور پھر بھی بیشتر حالات میں صحیح قیمت معین نہ ہو سکے گی۔ یہ چیز اسی طرح ناقابل عمل ہے۔ جیسے بعض لوگوں کا یہ تقاضا کہ زمینداروں کی زمین کی خرید کے اخلاقی پہلو کو دیکھا جائے، کہ کیا اس خرید میں جبر، تعدی یا کسی قسم کا دھوکا تو نہیں تھا، اور اگر ہو تو اس صورت میں زمین بلا معاوضہ حاصل کر لی جائے۔ ایسا کرنا قطعی طور پر ناقابل عمل ہے، اور اس طریق کار کی پیچیدگی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر آج سے سو سال پہلے کی ایک خرید کے متعلق اگر یہ طے بھی ہو جائے کہ وہ برضا و رغبت اور ایمانداری کے ساتھ خریدی گئی تھی، تو یہ کون طے کرے گا، کہ وہ روپیہ جس سے یہ زمین خریدی گئی، وہ حلال طریقوں سے حاصل کیا ہوا تھا، یا نہیں؟

معاوضہ کا اصول : اصل میں زمینوں کے معاوضے کا تعین گڑے مُردے اُکھاڑنے سے نہیں، بلکہ موجودہ حالات و واقعات کے پیش نظر زمیندار کے لئے اس کی زمینوں سے علیحدگی کو آسان بنانے سے ہو سکتا ہے، تاکہ وہ متبادل دَور میں گذر کر سکے اور اپنے آپ کو کسی دوسرے منفعت بخش کاروبار میں مصروف کر سکے۔ ہمارا نقطۂ نظر جماعتی نہیں ہے، بلکہ قومی ہے، اور قومی نقطۂ نظر سے یہ ضروری ہے، کہ معاوضے کا کوئی ایسا اصول مقرر کیا جائے۔ جس سے زمین کی قیمت اس کی موجودہ بڑھی ہوئی قیمت کی نسبت کافی کم زمیندار کو ملے، تاکہ زمین کی قیمت میں جو اضافہ قومی سرگرمیوں سے ہوا ہے اسے قوم واپس لے سکے،

لیکن وہ اتنی کم نہ ہو کہ خود زمیندار اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ اتفاقاً ایک ایسا اُصول بھی موجود ہے اور اس کا اطلاق کئی ملکوں میں ہو چکا ہے جن میں پاکستان کا مشرقی حصّہ شامل ہے کہ زمیندار کو اس کی سالانہ پیداوار کا ایک متضاعف ( ) ادا کیا جائے۔ یہ متضاعف زمیندار کی مالی قوت کے مطابق متزائد ( ) رکھا جاتا ہے، چنانچہ بہت بڑے زمینداروں کو سالانہ آمدنی کا صرف دو تین گنا دیا جاتا ہے متوسط زمینداروں کو چار پانچ گنا اور چھوٹے زمینداروں کو سات آٹھ گنا۔ زمین کا معاوضہ اصل میں زمین سے زمیندار کی علیحدگی کا معاوضہ ہے۔ ورنہ زمین کا معاوضہ صحیح معیّن کرنا بہت مشکل ہے۔ صرف اتنا یقینی ہے کہ اگر زمین کی قیمت میں سے ان قومی سرگرمیوں کا حصّہ وضع کر لیا جائے جو زمین کی قیمت کو بڑھاتی رہی ہیں تو غالباً زمین کی اصل قیمت مندرجہ بالا اصول کی نسبت بھی کم ٹھہریگی۔

گویا ہماری زرعی اصلاح کی زیادہ سے زیادہ بھی زمیندار کو اس کی زمین سے علیحدگی کا معاوضہ ادا کرنے سے انکار نہیں کرتی۔ اس طرح زرعی اصلاح کی دو حدیں معین ہو چکی ہیں۔ پہلی یہ کہ کوئی زمین کسی ایسے فرد کو کوئی فائدہ نہ دے گی جس پر وہ خود محنت نہ کرتا ہو اور دوسرا یہ کہ ہر وہ فرد جو اس وقت ان زمینوں سے بغیر محنت کے کوئی فائدہ اُٹھا رہا ہے اسے اس کی علیحدگی کی قیمت ادا کی جائیگی جو اس کی آمدنی کی چند گنی ہوگی۔

یہ دونوں چیزیں ہم سے پہلے مشرقی یورپ کے بیشتر ممالک کر چکے ہیں۔ یہ کام اُنھوں نے رُوس کی سیادت قبول کرنے سے بہت پہلے کیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ زمیندار کے پاس انھوں نے ایک محدود ٹکڑا رہنے دیا تھا جس پر وہ مزارع رکھ سکتا تھا لیکن ہمارا "کم سے کم" اس سے آگے جاتا ہے کہ ایک انچ زمین بھی کسی ایسے شخص کے پاس رہنے دینا مناسب نہیں سمجھتا جس پر وہ خود محنت نہ کرتا ہو۔ عام طور پر مشرقی یورپ کے ملک ان دونوں اہم چیزوں کے کرنے کے باوجود کوئی زرعی انقلاب پیدا نہ کر سکے، اور چونکہ یہ تجربہ کسی ایک مُلک نہیں بلکہ آٹھ دس مُلکوں کا ہے، لہٰذا ان کے تجربے کے نتائج کا مطالعہ ہمارے لئے ضروری ہے۔ یہ دونوں اقدام کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کی اور ترقی ان ملکوں میں پچیس فیصدی سے آگے نہیں بڑھی، وجہ یہ تھی کہ زرعی ترقی کے نئے اوزار جنھیں سائنس نے ایجاد کیا ہے، ان ملکوں میں کسی بڑے پیمانے پر استعمال نہیں کئے گئے اور ان چیزوں کے استعمال نہ ہونے کی وجوہات دو تھیں۔ پہلی یہ کہ وہاں کا کاشتکار پہلی جنگ عظیم کے بعد جب یہ اصلاحات نافذ ہوئیں ہمارے کاشتکار کی طرح علم اور سرمایہ دونوں سے تہی تھا۔ اور دوسری یہ کہ اس کی ان خامیوں کو پورا کرنے کے لئے کسی قسم کی راہ نمائی، تنظیم اور سرمایہ جو حکومتیں مہیّا کر سکتی تھیں، فراہم نہیں کیا گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ زرعی پیداوار کی تقسیم پہلے کی نسبت منصفانہ تو ہو گئی اور کسی حد تک پیداوار میں محض اس کی وجہ سے اضافہ بھی ہوا لیکن ترقی یافتہ زرعی سامان و آلات استعمال نہ ہوئے، جن کے بغیر زرعی پیداوار میں انقلاب ممکن نہیں ہے۔

ہمارا ابھی اصل مقصد تو زرعی پیداوار میں امکانی ترقی ہے لیکن مشرقی یورپ کا تجربہ بتاتا ہے کہ جو دو اُصول زرعی

اصلاح کے ہم نے وضع کئے ہیں وہ اپنی ذات میں کافی نہیں ہیں، ہمارے ہاں شاید فائدہ اتنا بھی نہ ہو جتنا مشرقی یورپ میں ہوا ہے کیونکہ کاشتکاروں کے کھیتوں کا اوسط ہمارے ہاں مشرقی یورپ کے اوسط سے بہت کم ہے اور ترقی یافتہ زرعی آلات اور سامان بڑے کھیت چھوٹے کھیتوں کی نسبت زیادہ سہولیت سے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہذا ہمارے ہاں تنظیم، راہ نمائی، اور سرمایہ مہیا کرنے کی ضرورت اور بھی زیادہ ہے تاکہ نئے کاشتکار جو اب زمینوں کی فصلوں کے مالک ہو گئے، وہ زمین سے اسکی امکانی پیداوار حاصل کر سکیں۔ یہ راہنمائی تو بیشتر باہر سے ہی آئیگی، کیونکہ ہمارے اوسط درجے کے کاشتکار زرعی ترقی کے امکانات سے عموماً بے بہرہ ہیں، اور سرمایہ کا بیشتر حصہ بھی ابتدا میں حکومتوں کو ہی مہیا کرنا پڑیگا۔ اگرچہ اس کا ایک معقول حصہ خود کاشتکار بھی مہیا کر سکیں گے اور سال بہ سال اس میں اضافہ بھی ہوگا تنظیم کا کام خود کاشتکاروں کو کرنا پڑیگا۔ اور یہ تنظیم کاشتکار اسی صورت میں مہیا کر سکیں گے، جب انھیں اس کی ضرورت کا احساس ہوگا۔ لہذا راہنمائی کرنے والوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ کاشتکاروں کو کسی قسم کی تنظیم پر مائل کریں۔ علیحدہ علیحدہ یہ کاشتکار کسی قسم کی زرعی ترقی کی سمت میں کوئی بڑا قدم نہیں اٹھا سکتے۔ لیکن ایک دوسرے کی مدد سے ترقی کے رستے بڑی حد تک ان کے لئے کھل جاتے ہیں۔ یہ تنظیم امداد باہمی کی کوئی صورت اختیار کریگی۔ حکومتوں کو اس چیز کا احساس ابھی تک نہیں ہوا کہ جب تک وہ ہر گاؤں کو کسی قسم کے ترقی یافتہ امداد باہمی کے اصول پر منظم نہیں کرینگی، زرعی اصلاح کے امکانات بڑے پیمانے پر قطعی طور پر موجود نہیں ہو سکتے۔

امداد باہمی خود بہت سی شکلیں اختیار کر سکتی ہے، اور مغربی یورپ جہاں کی زراعت میں خاصے وسیع پیمانے پر کارفرما ہے وہاں کی اسکی نوعیتیں کئی ہیں۔ امداد باہمی ایک طرح کا اشتراک ہے، اور یہ اشتراک وسیع بھی ہو سکتا ہے اور محدود بھی۔ یہ جتنا محدود ہوگا اتنا ہی اس کے فوائد کم ہوتے جائینگے، اور جتنا وسیع ہوگا، اتنا ہی انفرادی ملکیت کی اہمیت کم ہوتی جائیگی۔ زراعت میں امداد باہمی کئی شکلیں اختیار کر سکتی ہے جن میں بعض زیادہ اہم یہ ہیں :-

(۱) امداد باہمی کی ایسی انجمنیں جو ممبروں کو قرض مہیا کریں۔

(۲) امداد باہمی کی ایسی انجمنیں جو ممبروں کو قرض کے علاوہ کھاد، بیج اور زرعی آلات مہیا کریں۔

(۳) وہ انجمنیں جو علاوہ یہ سب کچھ کرنے کے زمین کی پیداوار کی فروخت کا انتظام بھی کریں۔

(۴) ایسی انجمنیں جن میں نہ صرف اوپر لکھی ہوئی سب چیزیں مشترک ہوتی ہیں بلکہ خود زمین کی کاشت اور اس پر محنت بھی مشترک ہوتی ہے، لیکن فصل کی کٹائی مشترک نہیں ہوتی، ہر ممبر اپنی زمین پر سے فصل خود کاٹتا ہے۔

(۵) ایسی انجمنیں جن میں اشتراک ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے اور خود زمین کی ملکیت بھی مشترک ہوتی ہے۔

امداد باہمی کی ان سب قسموں پر تجربہ کیا جا چکا ہے، اور مختلف قسم کے ماحول کے لئے ہر ایک قسم اپنی اہمیت رکھتی ہے۔ خود مغربی یورپ کے ممالک میں ان میں ہر ایک قسم کی امداد باہمی کے ادارے موجود ہیں اور اپنی نوعیت کے مطابق کم یا زیادہ فائدہ اپنے ممبروں کو پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں اپنی ضروریات کا جائزہ لینا چاہیئے کہ ہماری زرعی دقتیں دور کرنے کے لئے کس قسم

کا اشتراک ضروری ہے۔ اس اشتراک کی اہمیت سے انکار تو غالباً اب کسی کو نہیں ہوگا۔ صرف اشتراک کی مقدار کے متعلق اختلاف رائے کی گنجائش ہو سکتی ہے۔ پہلی تینوں قسموں کی امداد باہمی کی انجمنوں کے متعلق تو کوئی اختلاف رائے موجود نہیں ہے اور چوتھی سے کوئی مفر نظر نہیں آتا۔ جب تک کاشت مشترک نہ ہو ہمارے کھیتوں کا انتشار اپنی جگہ قائم رہے گا۔ مانا اب مزارع خود مالک بن گئے لیکن محض یہ کرنے سے تو ان کے بکھرے ہوئے کھیت مجتمع نہیں ہو جائیں گے۔ اور اگر ان کے کھیت مختلف جگہ کئی کئی ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں (جیسی کہ صورت اس وقت ہے) تو دنیا کی کوئی زرعی اصلاح ان کے لئے قابلِ عمل نہیں رہتی۔ لہٰذا ہمارے کھیتوں کا انتشار ہمیں مجبور کرتا ہے، کہ ہم چوتھی قسم کے امداد باہمی کے اصول سے ابتدا کریں۔ اس اصول کے مطابق کاشتکاروں کی غالب اکثریت کو اکٹھا کیا جا سکتا ہے۔ یہ اشتراکِ عمل ان کے موجودہ مسائل میں سے بیشتر کو حل کر دے گا، اور ہمارے عام کاشتکار کو اپنی زمین کے ساتھ جو گہرا لگاؤ ہے اسے بھی کالعدم نہیں کرے گا اس کی زمین کی شخصی ملکیت اس حد تک قائم رہے گی کہ وہ فصل وہی حاصل کرے گا، جو اس کی زمین پر ہوگی، اور اس طرح ذاتی نگرانی اور اپنے ٹکڑے پر محنت کرنے کی خواہش برقرار رہے گی۔ لیکن اس چیز کے علاوہ باقی ہر چیز مشترک ہوگی۔ کس کس ٹکڑے پر کیا بویا جائے، یہ گاؤں کے مشترکہ فیصلے سے طے پائے گا، پھر بونے کا عمل، کھاد، بیج، آبپاشی کے اوزار سب مشترک ہونگے، اس کے بعد فصل کی نگرانی اور فصل کا کاٹنا انفرادی ہوگا، لیکن کاٹ چکنے کے بعد فصل کی فروخت کا انتظام اجتماعی طور پر کیا جائے گا۔

اس اصول پر بیشتر کاشتکار صرف اپنی صوابدید سے بھی متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن بعض آدمی ہر قسم کے ماحول میں ایسے ہوتے ہیں، کہ محض اپنی فطرت سے مجبور ہو کر نیکی کے ہر کام میں روڑا بن جاتے ہیں، پاکستان کو اگر اپنی زراعت میں کوئی قابلِ قدر انقلاب پیدا کرنا ہے، تو ان لوگوں کو کھلی چھٹی نہیں دی جا سکتی، کہ وہ امداد باہمی کی مفید صورت پر بھی عمل کرنے سے انکار کر دیں۔ ظاہر ہے، کہ ہمارے سیاسی معتقدات اس قسم کے جبر کو جائز نہیں سمجھتے جو روس میں اختیار کیا گیا۔ اور چین کے مطابق اشتراک سے انکار کرنے والے زمینداروں کو اپنے کھیتوں کے علاوہ اپنی جانوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ لیکن اس حد تک جبر کرنا مناسب ہوگا، کہ یہ لوگ قومی تقاضوں کو نظر انداز کر کے اس قسم کی انجمنوں سے باہر نہ رہ سکیں۔

مسئلۂ زمین اور اسلام

مصنفہ پروفیسر محمود احمد

قیمت ۸؎

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور، پاکستان

مشکلات القرآن
محمد حنیف ندوی

ایک آیت

مصائب کی تین قسمیں: طبعی و قدرتی تباہیاں۔ عذاب اور آزمائشی تکلیفیں

ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ ولما یاتکم مثل الذین خلوا من قبلکم مستھم الباساء والضراء وزلزلوا حتی یقول الرسول والذین آمنوا معہ متی نصر اللہ۔ الا ان نصر اللہ قریب (بقرہ)

کیا تم خیال کرتے ہو کہ مزے سے بہشت میں جا داخل ہو گے، اور وہ بھی تک تم کو ان لوگوں کی سی حالت پیش نہیں آئی، جو تم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ کہ ان کو سختیاں پہنچیں اور تکلیفیں بھی پہنچیں اور جھڑ جھڑائے بھی گئے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور ایمان لانے والے جو ان کے ساتھ تھے، چلا اُٹھے۔ کہ آخر خدا کی مدد آنے کا کوئی وقت بھی ہے؟ سنو! اللہ کی مدد کا وقت قریب آ لگا ہے۔

پہلی قسم: مصائب کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم وُہ ہے جس کا کوئی تعلق ہمارے اعمال و معتقدات کے حسن و قبح کے ساتھ نہیں اور ہماری بدچلنی اور نیکی کے ساتھ نہیں۔ ان کا آنا سراسر منشاء ایزدی کے تابع ہے۔ کیونکہ اس کی اپنی کچھ تخلیقی مصلحتیں ہیں، جن کو اس کے سوا دوسرا کوئی نہیں جان پاتا۔ اسلئے جب ان مصلحتوں کا تقاضا یہ ہوتا ہے، کہ کائنات ارضی کسی ہولناک تباہی سے دوچار ہو تو ایسا ہو کر رہتا ہے اور ایسا ہونا اس کی وسیع ترین حکمتوں کے پیش نظر مفید و ضروری بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ہماری محدود اور ناقص عقل اس فائدہ و ضرورت کی تہہ تک رسائی حاصل نہ کر سکے اور طرح طرح کی بدگمانیوں کا شکار ہو۔ سختیوں اور ہلاکت آفرینیوں کی یہ صورت چونکہ کائنات کے ایسے پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہے، جو اللہ تعالےٰ کے بنائے ہوئے طبعی قوانین کا براہ راست نتیجہ ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسکی لپیٹ میں ایمان و کفر کی تمیز کئے بغیر ہر شئے آسکتی ہے۔ یہی وجہ ہے، کہ جب زلزلہ آتا ہے، آندھیاں چلتی ہیں اور دریا طوفانوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ تو ان سے ہر شخص کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ مومن متقی کا بھی، اور فاجر عشلی کا بھی، اس کا بھی جو دن رات اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہے، اور اس کا بھی جو شب و روز معصیت میں غرق رہتا ہے۔ اس سے سرمایہ داروں کے سر بفلک محلات بھی شکستہ ہوتے ہیں، اور غریبوں اور نادار وں کے جھونپڑے بھی۔ یہ تباہیاں دیر و کشت کی تفریق کی قائل نہیں۔ ان کی زد میں مندر کے اونچے کلس بھی آتے ہیں، اور مسجد کے بلند کنگرے بھی۔

دوسری قسم: دُوسری قسم وہ ہے جس کو ہم عذابِ الٰہی کے نام سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ اس کی پھر دو قسمیں ہیں۔ ایک عذاب وہ ہے جو

اس لئے آتا ہے کہ کسی قوم نے اپنی بدبختی سے اللہ تعالیٰ کے فرستادوں کو جھٹلایا ہے۔ اور اس حد تک ان کی تکذیب کی ہے۔ کہ اب کوئی امید اصلاح کی باقی نہیں رہی، اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا غضب بھڑکتا ہے اور اس قوم کو صفحۂ ہستی سے ملیامیٹ کر دیا جاتا ہے تاکہ انکی بداعمالیاں دوسروں تک متجاوز نہ ہوں، اس نوع کے عذاب کا تذکرہ قرآن میں اکثر آیا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے استیصال اور کلی تباہی مقصود نہیں ہوتا۔ بلکہ تنبیہ و انذار مقصود ہوتا ہے۔

تیسری قسم: عذاب الٰہی کی ایک تیسری صورت بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے بعض اعمال کی پاداش میں ہمیں سزا دینا چاہتا ہے اور یہ جتانا چاہتا ہے، کہ نیکی و برائی میں بہرحال ایک فرق ہے۔ پاکبازی اور بدمعاشی کے نتائج میں بہر نوع کچھ امتیاز ہے۔ اور یہ کہ اللہ تعالیٰ اس معاملہ میں بالکل غیر جانبدار نہیں کہ انسان کو فکر و نظر کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دے۔ بلکہ اس کو نیکی پسند ہے، اور برائی سے نفرت ہے۔ نیکی کے سلسلوں کو وہ آگے بڑھانا چاہتا ہے اور برائی کو ختم کرنے کے درپے ہے ـــــ عذاب کی یہی وہ شکل ہے۔ جس کی ذمہ داری قرآن انسان پر ڈالتا ہے:

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر۔ (شوریٰ ۳۰)

اور تم پر جو مصیبت پڑتی ہے تو تمہارے اپنے ہی کرتوت سے اور خدا بہت سے قصوروں سے درگذر کرتا ہے۔

ایک اور قسم: قرآن کی محولا بالا آیت میں جن مصائب اور سختیوں کا ذکر ہے، انکی نوعیت ان سب سے مختلف ہے۔ یہ انبیاء کی زندگی ہی میں انکے ماننے والوں پر آتی ہیں۔ اور ایسی شدید کہ یہ ماننے والے چیخ چیخ اٹھتے ہیں، مایوسیاں ابھر ابھر کر ایمان و ایقان کی استواریوں پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ اور دل پکار پکار اٹھتے ہیں کہ پروردگار تیری رحمتیں کب شامل حال ہونگی۔ ثبات و استقلال کے پاؤں اکھڑ اکھڑ جاتے ہیں۔ اور عزم و ارادہ کے سفینے اس طرح بھنور میں چکر کھاتے ہیں کہ انبیاء تک انکے ہمنوا ہو کر اللہ کی مدد کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ ـــ عین اس وقت بیم و رجاء کی اس کشاکش میں خوشخبری سنائی جاتی ہے کہ گھبراؤ نہیں۔ اللہ کی مدد بس پہنچنے ہی والی ہے۔

مصائب کی اس نوعیت سے جو محض آزمائش کی غرض سے پیش آتی ہے کئی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ ایک تو اس سے اس نصب العین کا عشق اور بڑھتا اور تیز ہوتا ہے۔ جس کی پاداش میں یہ سب مصیبتیں آتی ہیں اور قومیں یہ جان پاتی ہیں کہ جتنا بلند نصب العین ہوگا، اسی انداز سے مصائب و محن کو برداشت کرنا پڑیگا۔ اور اسی نسبت سے حوصلہ و عزم کی سطحوں کو اونچا رکھنا پڑیگا۔ کیونکہ مصیبتیں اس کے سوا آخر کیا ہو سکتی ہیں کہ اللہ کا ایک بندہ جامد و ساکت فضا میں ایک نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے اور مخالفین و اعداء اس نعرۂ مستانہ کی انقلاب آفرینیوں کو بھانپ لیتے ہیں اور اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس سے ہمارے خصوصی فوائد اور مراعات کو کیا کیا نقصان پہنچنے والا ہے۔ اس لئے یہ سب اس پر جمع ہو جاتے ہیں کہ اس آواز کو ابھرنے نہ دیا جائے ورنہ ہماری موجودہ سیادتیں ختم ہو جائیں گی۔ اور ہم ان حقوق سے محروم ہو جائیں گے جو معاشرہ میں ہمیں پہلے سے میسر ہیں ـــــ اس حقیقت کو واضح طور پر سمجھنے کے لئے اسلام کی ابتدائی تاریخ کے اوراق الٹ کر دیکھئے۔ جب آنحضرت ﷺ نے انسان کو شرک و بت پرستی کے حضیض سے نکالنے کی جدوجہد کی اور یہ چاہا کہ یہ اپنے مقام کو پہچاننے لگے۔ اور کاہنوں کے جنگل سے خلاصی حاصل کرے، تو صنادید قریش نے